اسلام اور مستشرقین

تفہیم القرآن کا ایک جائزہ

——————— جناب ایس، اے، حامد ہاشمی

اسلام سے مستشرقین کی دلچسپی کا سلسلہ صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اس طویل مدت میں مغربی مصنفین نے اسلام کا بڑی وسعت کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور اس پر تحقیق کی ہے۔ انہوں نے اپنی تحقیق اور مطالعہ کے ذریعہ اسلام کی کافی خدمات انجام دی ہیں، جس کے خود صاحبِ نظر مسلمان قائل ہیں۔ بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ''سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں مفید کتابیں انہوں نے اسلام پر تصنیف کی ہیں'' [۱] مثلاً سخاؤ، لین پول، جارج براؤن، سرتھامس آرنلڈ، اے جے آربری، رینالڈ نکلسن، ٹری میگھم وغیرہ کی کاوشوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ان مستشرقین میں ایک بڑا گروہ ایسا بھی ہے جس کی تحقیق اور مطالعے نے اسلام، اِس کی مقدس کتاب قرآن کریم، اس کے رسول محمد ﷺ اور اسلام کی دیگر تعلیمات اور ہدایات کو اپنی بے جا تنقید کا ہدف بنایا ہے اور جس وسعت کے ساتھ انہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے اسی پیمانہ پر اس میں نکتہ چینیاں بھی کی ہیں۔ مغرب کی ترقی یافتہ قوم، جو خود کو جدید تحقیقی ٹیکنک کا موجد سمجھتی ہے، اسلام پر مختلف قسم کے غیر معقول اور مہمل اعتراضات بھی کرتی رہی۔ اس کا سلسلہ آج بھی ہے جو کسی ترقی یافتہ قوم کے شایان شان نہیں ہے۔

اسلام کے خلاف ان کی اس منظّم تحریک کی وجہ سے اس کے بارے میں نہ صرف غیر مسلم دنیا میں، بلکہ خود مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں غلط فہمیاں اور شکوک وشبہات پیدا ہوگئے ہیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ ان کی تنقید اور اعتراضات کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے، بے جا اعتراضات کی تردید کی جائے اور غلط فہمیوں کو دور

کر کے اسلام کا صحیح نقشہ پیش کیا جائے۔ اس اہم کام کا بیڑا ہمارے مختلف علمائے کرام اور مفکرین اسلام نے اٹھایا اور نہایت علمی انداز میں اپنی تحریروں کے ذریعہ سے اس فرض کو انجام دیا ہے۔ ان حضرات کی فہرست میں برصغیر ہند و پاک کی اہم شخصیت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (١٩٠٣-١٩٧٩) کی بھی ہے۔ زیر نظر مضمون میں مولانا مودودی کی 'تفہیم القرآن' میں اسلام پر مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

اس موضوع کے لیے تفہیم القرآن کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ ایک تو یہ مولانا کی جملہ تصانیف کا نچوڑ ہے اور دوسرے اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ مستشرقین کی تحریروں سے مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اپنے مذہب کے بارے میں جو شکوک وشبہات پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کیا جائے۔[٢] تفہیم القرآن میں مستشرقین کے اسلام پر جن اعتراضات کے متعلق بحث کی گئی ہے، ذیل کے عنوانات کے تحت ان کا ایک جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

قرآن پر اعتراضات

(ا) قرآن نے بائبل اور یہودی روایات نقل کی ہیں۔

مستشرقین نے قرآن کے مختلف واقعات کو بائبل یا یہودی روایات سے ماخوذ قرار دیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے قصوں کو ان ہی کتابوں کی نقل ثابت کرنے کی انہوں نے کوشش کی ہے۔ ان کے اس الزام کی تردید میں مولانا مودودی نے مختلف زاویوں سے چند اہم ثبوت پیش کیے ہیں۔ سب سے پہلا ثبوت مولانا کے نزدیک ان دونوں کتابوں یعنی تلمود اور بائبل کے بیانات اور قرآن کے بیانات میں اختلاف کا پایا جانا ہے۔ لکھتے ہیں کہ جن قصوں کو ان مستشرقین نے ان کتابوں سے ماخوذ قرار دیا ہے اگر کوئی ان تینوں کتابوں کا تقابلی مطالعہ کرلے تو خود بخود اس الزام کی تردید ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا نے خود انبیاء علیہم السلام کے مختلف واقعات کا ان دونوں

کتابوں سے تقابلی جائزہ لیا ہے۔ مثلاً آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کا واقعہ قرآن میں سات مرتبہ آیا ہے (۲:۳۸-۴۰، ۷:۱۱-۲۵، ۱۵:۲۶-۴۸، ۱۹:۶۰-۶۵، ۱۸: ۲۰-۵۰، ۱۱۶-۱۲۳، ۳۸:۷۱-۸۵) ان آیات کا مقابلہ ہم بائبل کی کتاب 'پیدائش' کی ان آیات سے کریں جن میں آدمؑ اور بنی نوع انسان کی پیدائش کا ذکر آیا ہے تو دونوں کا فرق صاف ابھر کر سامنے آتا ہے۔[۳] جیسا کہ بائبل میں ہے ''آدم اور اس کی بیوی دونوں ننگے تھے اور شرماتے نہ تھے ... سانپ نے عورت سے کہا کہ ہرگز تم نہ مروگے، بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے، تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کے مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔ چنانچہ عورت نے اسے کھایا اور اپنے شوہر کو بھی کھلایا، تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنی لنگیاں بنائیں۔[۴] لیکن قرآن میں آدمؑ اور ان کی بیوی کے بارے میں آیا ہے کہ ''نہ بھوکے ننگے رہتے ہو'' اور آگے آیا ہے کہ ''شیطان کے بھٹکاوے میں آکر وہ اسی درخت کا پھل کھا گئے ... فوراً ہی ان کے ستر ایک دوسرے کے آگے کھل گئے۔ دونوں اپنے آپ کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے''[۵]

قرآن کے بیانات کے مطابق آدم علیہ السلام کی عورت نے اُسے کھایا اور اپنے شوہر کو کھلایا نہیں، بلکہ دونوں نے کھایا ہے۔ اور وہ ننگے نہیں تھے، بلکہ ان کے ستر کھل گئے۔ دونوں باتوں میں واضح فرق ہے۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت، جو تلمود اور بائبل میں بیان کی گئی ہے، قرآن سے بہت مختلف ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں تلمود کے بیانات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بیانات بے جوڑ اور بہ کثرت خلاف قیاس ہیں۔ اس کے برخلاف قرآن میں آپ کی زندگی کے واقعات بالکل صاف، مستقل اور مربوط طریقے سے پیش کیے گئے ہیں۔ سورۂ انبیاء اور تلمود کے تقابلی مطالعہ سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے۔[۶]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تلمود، بائبل اور قرآن کے بیانات

میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ القصص کی مندرجہ ذیل آیات کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''ان عورتوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا: ابا جان، اس شخص کو نوکر رکھ لیجئے۔ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہوسکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔ اس کے باپ نے (موسیٰ سے) کہا: میں چاہتا ہوں کہ اپنی دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمھارے ساتھ کر دوں، بشرطے کہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو۔'' (آیات: ٢٦-٢٧) یعنی قرآن کے مطابق ان لڑکیوں کے والد نے خود نکاح کی پیش کش کی تھی۔ لیکن تلمود میں حضرت موسیٰ کو ان لڑکیوں میں سے ایک پر گرویدہ بتایا گیا ہے اور پھر آگے بیاہ کا بیان آتا ہے۔ ٧

اسی سورۃ القصص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اللہ سے مخاطبت کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام آٹھ سال کی مدت پوری کرنے کے بعد اپنے اہل و اعیال کو لے کر جب مدین سے روانہ ہوئے تو سفر میں اللہ سے مخاطبت اور منصب نبوت پر تقرر کا واقعہ پیش آیا۔ لیکن تلمود کہتی ہے کہ یہ واقعہ پہاڑ حورب کے قریب پیش آیا، جب کہ موسیٰ علیہ السلام وہاں اپنے خسر کی بکریاں چرا رہے تھے۔ ٨

حضرت موسیٰ کے ایک اور واقعہ کو جو سورۂ کہف کی آیات ٦٠ تا ٦٥ میں آیا ہے، جس میں اپنے خادم کے ساتھ سفر اور مچھلی کے دریا میں چلے جانے کا بیان ہے۔ مستشرقین نے اس کو یہودی روایات سے ماخوذ ٹھہرایا ہے اور الزام عائد کیا ہے کہ محمدؐ نے اس واقعہ کو داستانِ گلگامش اور سکندر نامہ سریانی سے نقل کیا ہے، جس کا ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ٩

مستشرقین کے زیر بحث الزام کی تردید میں دوسرا ثبوت یہ ہے کہ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے چند ایسے واقعات بھی بیان ہوئے ہیں جن سے تلمود اور بائبل خالی ہیں۔ مثلاً سورۃ المائدۃ کی آیات ٢٧-٣١ میں حضرت آدمؑ کے بیٹوں کا قصہ آیا ہے۔ وہ تلمود میں تو ہے، لیکن بائبل میں نہیں ہے ١٠ بائبل میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی وفات کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا ہے، لیکن وہ اہم وصیت جو کہ سورۃ البقرہ کی آیات

۱۳۲-۱۳۳ میں بیان کی گئی ہے، جس میں یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے اسی خدا کی بندگی کرنے کا وعدہ کیا تھا جس کی بندگی ان کے آباواجداد نے کی تھی، بائبل میں نہیں ہے[۱۱] حضرت یوسف علیہ السلام کی مندرجہ ذیل تقریر بھی بائبل اور تلمود میں کسی جگہ نہیں ملتی:

''یوسفؑ نے کہا: ابا جان، یہ تعبیر ہے میرے اس خواب کی جو میں نے پہلے دیکھا تھا، میرے رب نے اسے حقیقت بنا دیا۔ اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے قید خانہ سے نکالا اور آپ لوگوں کو صحراء سے لاکر مجھ سے ملایا، حالاں کہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال چکا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا رب غیر محسوس تدبیروں سے اپنی مشیت پوری کرتا ہے۔ بے شک وہ علیم اور حکیم ہے۔ اے میرے رب، تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھایا۔ زمین و آسمان کے بنانے والے، تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے۔ میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا''۔[۱۲]

حضرت یوسف علیہ السلام کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ، جس کا بیان قرآن میں آیا ہے، وہ دیگر آسمانی کتب میں ہم کو نہیں ملتا۔ تفصیل یوں ہے کہ ''شہری عورتیں آپس میں چرچا کرنے لگیں کہ عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ محبت نے اس کو بے قابو کر رکھا ہے۔ ہمارے نزدیک تو وہ صریح غلطی کر رہی ہے۔ اس نے ان کی جو مکارانہ باتیں سنیں تو ان کو بلوا بھیجا اور ان کے لیے تکیہ دار مجلس آراستہ کی اور ضیافت میں ....'' (سورہ یوسفؑ آیات ۳۰-۳۱) بائبل میں اس ضیافت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ تلمود میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے جو قرآن کے بیان سے بہت مختلف ہے۔[۱۳]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مصر سے مدین کے سفر کے تعلق سے بیانات میں بھی بہت کچھ اختلاف ہم دیکھ سکتے ہیں۔ تلمود میں اس سفر کے بارے میں ہے کہ آپؑ مصر سے بھاگ کر حبش چلے گئے اور وہاں انہوں نے اسرایا (شمالی عراق) والوں کی

بغاوت کچلنے میں بادشاہ کی مدد کی تھی۔ اور اس طرح انہوں نے بادشاہ کا قرب حاصل کیا اور پھر بادشاہ کی وفات کے بعد وہاں کے عوام نے آپؑ کو اپنا بادشاہ منتخب کرلیا اور اس کی بیوی سے حضرت موسیٰؑ کی شادی بھی کردی۔ اس طرح ۴۰ سال گذرنے کے بعد وہ حبش سے مدین پہنچے، لیکن مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ تاریخ کی رو سے یہ قصہ غلط ہے، کیوں کہ حبشیوں کو کبھی ان ممالک پر تسلط حاصل نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا بنی اسرائیل نے یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ غلط منسوب کیا ہے اور یہ ان کی تاریخ سے لاعلمی کا ٹھوس ثبوت ہے۔[۱۴]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ کا ایک اور اہم واقعہ وہ ہے جو آپ کی فرعون سے کش مکش کے بیان میں سورہ المومن کی آیات ۲۵ تا ۲۹ میں بیان ہوا ہے۔ اس کو بھی بنی اسرائیل کی قوم نے بھلا دیا ہے اور قرآن ان کو پھر سے یاد دلاتا ہے۔[۱۵]

مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں کہ دراصل قرآن ان کتابوں سے قصے نقل نہیں کرتا، بلکہ وہ ان کے بہت سے قصوں کی اصلاح کرتا ہے۔ قدیم انبیاء علیہم السلام اور ان کی اقوام کے واقعات کی صحیح شکل سے دنیا کو روشناس کراتا ہے، جن کو اہلِ کتاب نے فراموش کردیا ہے۔ ان اہل کتاب پر قرآن کریم کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ان کے اکابرین کے دامن کو خود ان کی پھینکی ہوئی گندگیوں سے پاک کیا ہے۔[۱۶] ایک جگہ مولانا رقم طراز ہیں کہ بائبل اور تلمود میں وارد انبیاء علیہم السلام کے اکثر واقعات صحیح ہیں، لیکن ان میں اکثر جگہ ان کے مصنفین نے کمی بیشی کی ہے۔ اگر ان کو آمیزش سے صاف کردیا جائے تو ان کی اصولی تعلیمات اور قرآن کی تعلیمات میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہ جاتا۔[۱۷] مثلاً حضرت سلیمانؑ کو بائبل میں اللہ کے نبی نہیں، بلکہ محض ایک بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ جیوش انسائیکلو پیڈیا (ج ۱۱، ص ۴۴۱-۴۳۹) کے حوالے سے مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے تو حضرت سلیمانؑ پر تورات کے احکام کی خلاف ورزی، غرورِ حکومت، غرورِ عقل و دانش، زن مریدی، عیش پرستی جیسے الزام عائد کئے ہیں۔[۱۸] حضرت ابراہیمؑ کی نسبت بھی

تلمود میں نہایت ہی گھناونے قسم کے بیان آئے ہیں، جو عقل و دانش کی رسائی سے دور ہیں ۱۹ اہل کتاب کی ان کتب مقدسہ میں حضرت یوسفؑ اور عزیز مصر کی بیوی کے قصے میں حضرت یوسفؑ ہی کو قصوروار ٹھہرایا گیا ہے۔ لیکن قرآن اِس کی صفائی پیش کرتا ہے کہ پیغمبر خدا نہیں، بلکہ ایک دنیا دار عورت یعنی عزیز مصر کی بیوی ان کے حسن کی گرویدہ ہوگئی تھی۔ ۲۰

اوپر درج کی گئی ہر مثال کا تفصیلی جائزہ لینے سے خود بخود پڑھنے والوں کے سامنے حقائق کھل کر آ جاتے ہیں اور مستشرقین کی اسلام کے ساتھ معاندانہ روش کا پتہ چل جاتا ہے کہ محض مفروضوں کی بنیاد پر وہ اللہ کے کلام اور اس کے رسولؐ کو جھوٹا (معاذ اللہ) ثابت کرنے کی کیسی کیسی کوشش کرتے چلے گئے ہیں۔ یہ تھے چند اہم ثبوت جو قرآن پر الزامات کی تردید میں پیش کیے گئے۔

قرآن مجید کو سابقہ صحف سماوی سے ماخوذ ثابت کرنے کی جو کوشش کی جاتی ہے اس سلسلہ میں مولانا نے بعض اہم سوالات اٹھائے ہیں:

۱۔ قرآن کے بیانات کو مستشرقین نے چند کتابوں سے ماخوذ قرار دیا ہے۔ اس مفروضہ کی تائید میں ان کے پاس کیا دلیل ہے؟

۲۔ جن کتب کو قرآن کا ماخذ قرار دیا گیا ہے، اگر ان کو یکجا کردیا جائے تو ایک اچھی خاصی لائبریری کی فہرست تیار ہو جائے گی۔ کیا جزیرۂ عرب میں کوئی ایسی لائبریری اُس زمانے میں موجود تھی؟

۳۔ مختلف مستشرقین نے جن مختلف زبانوں کی کتابوں کو قرآن کا ماخذ قرار دیا ہے۔ کیا مکہ یا مدینہ میں حضورؐ کے زمانے میں مترجمین کا کوئی ایسا گروہ موجود تھا جو مسلسل کتابوں سے ترجمہ کرکے فوراً آپ کو مہیا کرتا تھا۔

۴۔ جزیرۂ عرب سے باہر آپؐ نے چند تجارتی سفر ضرور کئے تھے، لیکن کیا کوئی ثابت کرسکتا ہے کہ آپؐ وہاں سے اِن کتابوں کی نقل لائے تھے، یا ان کو

حفظ فرمایا تھا؟

۵۔ اگر ان سفروں کے دوران میں جزیرہ عرب سے باہر کسی مقام پر راہبوں یا ربیوں سے آپؐ نے کچھ علم حاصل کیا ہوتا تو تاریخ میں اس کا ثبوت کیوں نہیں ملتا؟ کم از کم رومی سلطنت کی تاریخ میں تو اس کا ذکر ہونا چاہیے تھا۔

۶۔ آج کے مستشرقین کی طرح اس دور کے کفار مکہ اور متعصب یہودیوں اور نصرانیوں کا بھی دعویٰ تھا کہ آپؐ کو کہیں سے معلومات فراہم کی جارہی ہیں۔قرآن نے ان لوگوں کو چیلنج بھی کیا تھا کہ وہ اپنے الزام کا ثبوت پیش کریں۔لیکن وہ اپنے دعویٰ کا ثبوت لانے اور قرآن کا چیلنج قبول کرنے میں کیوں ناکام رہے۔[۲۱]

یہ چند ایسے سوالات ہیں جہاں واقعہ یہ ہے کہ ان مستشرقین کی تحقیق جواب دے جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود ان محققین کے گروہ سے ایسے لوگ سامنے آرہے ہیں جو ان کے پیش رووں کی غلطیوں کا برملا اعتراف کرتے ہیں اور حقائق کو قبول کرتے چلے جارہے ہیں۔

(۲) واقعۂ شق القمر

معترضین (مستشرقین) نے معجزۂ شق القمر کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے، اس لیے کہ یہ ان کے نزدیک خلاف عقل ہے۔قرآن کی آیت ''قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ پڑا'' (القمر:۱) پر ان کا اعتراض یہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک عظیم کرہ دفعتاً دو ٹکڑوں میں منقسم ہو جائے اور فوراً ہی اپنی اصلی حالت میں لوٹ آئے؟ اس اعتراض کے جواب میں مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ جدید سائنسی تحقیقات نے اس طرح کے عمل کو ممکن بتایا ہے اور آج سائنس کی ترقی نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ایک کرہ اپنی اندرونی آتش فشانی قوت کے باعث پھٹ سکتا ہے اور اس کے دو ٹکڑے دور تک پھیل سکتے ہیں اور مقناطیسی کشش کے ذریعہ پھر اپنی اصلی حالت میں جڑ سکتے ہیں۔

اس واقعہ پر اعتراض کی دوسری بنیاد تاریخ اور علم نجوم کی کتابوں میں اس کی عدم موجودگی ہے ۔اس واقعہ کا تاریخ اور علم نجوم میں ذکر نہ ہونے کے مولانا کئی اسباب بتاتے ہیں۔اول یہ کہ یہ صرف ایک لمحہ کے لیے وقوع پذیر ہوا تھا اور کسی کو اس کی پیشگی اطلاع نہ تھی کہ لوگ وقت پر اس کا مشاہدہ کرسکیں، یا ضروری نہیں کہ اس خاص لمحہ میں لوگ چاند پر نظر جمائے بیٹھے ہوئے ہوں۔ دوم یہ کہ اس واقعہ کی وجہ سے دنیا کے نظام میں کوئی قابل لحاظ تبدیلی نہیں آئی تھی جس پر بعد میں مزید تحقیق کی جاتی۔ سوم، دنیا کے ہر خطہ میں اس کو دیکھنا ممکن نہیں تھا، کیوں کہ اس وقت چاند صرف عرب اور اس کے مشرقی جانب کے ممالک ہی میں نمودار ہوا تھا۔ دیگر علاقوں میں یا تو مطلع صاف نہ ہوگا، یا پھر چاند کے نظر نہ آنے کا وقت ہوگا۔ چہارم یہ کہ واقعہ اس زمانے کا ہے جس میں تاریخ نگاری کا فن اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ واقعہ کو فوراً نوٹ کرلیا جائے۔ چنانچہ دیکھنے والوں کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اس واقعہ کو تاریخی واقعہ کی حیثیت سے درج کرلیں۔یا اس زمانے میں اتنے با اثر آلات ایجاد نہیں ہوئے تھے کہ اس واقعہ کو ریکارڈ کرلیا جاتا۔[۲۲]

شیخ التفسیر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی تقریباً یہی وجوہ بیان کئے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ تاریخ میں اس واقعہ کی عدم موجودگی کی بنا پر اس کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم تاریخ فرشتہ میں اس واقعہ کا ذکر موجود ہے اور کہا جاتا ہے کہ مالابار کا مہاراجہ اس معجزہ سے متاثر ہوکر ہی مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔[۲۳]

(۳) حضرت یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکل آنا

''اور یقیناً یونسؑ بھی رسولوں میں سے تھا...... آخر کار مچھلی نے اسے نگل لیا اور وہ ملامت زدہ تھا۔اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو روز قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں رہتا۔آخر کار ہم نے اُسے بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینک دیا'' (الصّٰفّٰت :۱۳۹-۱۴۶)

معترضین نے قرآن کے اس بیان پر بھی اعتراض کیا ہے اور عقلی بنیادوں پر اِس کو ناممکن قرار دیا ہے۔ اس اعتراض کے رد میں مولانا نے ''اردو ڈائجسٹ'' فروری ۱۹۶۴ء کے حوالے سے انہی معترِضین کی سرزمین انگلستان کے سواحل پر وقوع پذیر ایک واقعہ پیش کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ماہ اگست ۱۸۹۱ء میں کچھ مچھیرے ایک جہاز میں سوار انگلستان کے سواحل پر وھیل مچھلی کے شکار کی غرض سے سمندر میں دور تک نکل پڑے اور انہوں نے ایک بہت بڑی مچھلی کو اپنے شکار کا نشانہ بنایا۔ اس سوٹن وزنی ۲۰ فٹ لمبی اور ۵ فٹ چوڑی مچھلی سے لڑائی کے دوران ان مچھیروں میں جمیز بارٹلے نامی ایک شخص کو اس کے دوسرے ساتھیوں کی آنکھوں کے سامنے اس مچھلی نے نگل لیا۔ آگے یوں لکھتے ہیں کہ دوسرے دن وہی مچھلی ان مچھیروں کو مردہ ہاتھ لگی۔ کافی محنت و مشقت کے بعد وہ اس کو ساحل پر لائے اور جب اس کا پیٹ چاک کیا تو ان کا ساتھی جمیز بارٹلے جو ۶۰ گھنٹے مچھلی کے پیٹ میں رہ چکا تھا، زندہ برآمد ہوا۔ اِس بحث کو مولانا نے ایک قابل غور سوال پر ختم کیا ہے ''اگر معمولی حالات میں فطری طور پر ایسا ممکن ہے تو غیر معمولی حالات میں اللہ تعالیٰ کے معجزے کے طور پر ایسا ہونا کیوں غیر ممکن ہے؟''[۲۴]

(۴) سامری کا واقعہ

''فرمایا اچھا تو سنو ہم نے تمھارے پیچھے تمھاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے انہیں گم راہ کر ڈالا'' (طٰہٰ: ۸۵)۔ قرآن کی رو سے یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا ہے جب کہ سامری نام کے ایک شخص نے بنی اسرائیل میں سنہری بچھڑے کی پرستش کی بنا ڈالی تھی۔ لیکن مستشرقین کہتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ کے دور کے کئی صدیوں بعد کا ہے، کیوں کہ اسرائیل کا شہر ''سامریہ'' اس واقعہ کے کئی صدیوں بعد ۹۲۵ ق م کے قریب کے زمانے میں تعمیر ہوا، پھر اس کے بعد اسرائیلوں اور غیر اسرائیلوں کی وہ مخلوط نسل پیدا ہوئی جس نے سامریوں کے نام سے شہرت پائی۔ ان مستشرقین کا خیال ہے کہ سنہری بچھڑے والا واقعہ اسی سے منسوب ہے اور

قرآن کے مصنف نے یہودیوں سے سن کر اس واقعہ کو حضرت موسیٰ کے عہد سے جوڑ دیا ہے (معاذ اللہ)

اِس اعتراض کے جواب میں مولانا لکھتے ہیں کہ ان مستشرقین کے اعتراض کی بنیاد شاید ان کا یہ مفروضہ ہے کہ قدیم زمانے میں ایک نام کا ایک ہی شخص یا ایک ہی قبیلہ یا مقام ہوا کرتا تھا۔ اور ایک ہی نام کے دو یا زاید اشخاص یا قبائل یا مقامات نہیں ہوا کرتے تھے۔ لیکن ان معترضین کو شاید یہ نہیں معلوم کہ ''سمیری'' نام کی ایک قوم حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں عراق اور اس کے قرب و جوار میں اپنی شہرت رکھتی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں ہی کے کچھ لوگ مصر میں آباد ہوئے ہوں اور ''سامری'' کے نام سے پکارے جاتے ہوں۔ نیز بائبل میں بھی ''سمر'' نام کے شخص کے وجود کا ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اسرائیل کے حکمران اعمری نے اس نام کے ایک شخص سے ایک پہاڑ خریدا تھا اور اُس پر اپنا دارالسلطنت تعمیر کیا تھا اور شہر کا نام اس کے پرانے مالک کے نام سے یعنی ''سامریہ'' سے موسوم کیا تھا۔ (سلاطین ۱، باب ۱۶، آیت ۲۴) مطلب یہ ہے کہ ''سامریہ'' شہر کی تعمیر سے قبل ''سمر'' نام کے لوگ موجود تھے۔ قرآن میں ''السامری'' کا جو ذکر ہے اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں ''سامری'' قبیلے یا نسل یا مقام کے کئی آدمی موجود تھے، جن میں سے کسی خاص شخص نے یہ حرکت کی ہوگی۔ ۲۵

ڈکشنری آف اسلام کے مصنف تھامس پیٹرک ہوفس نے بھی بیضاوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس شخص کا نام موسیٰ بن ظفر تھا اور اس کا تعلق قبیلہ سامری سے تھا۔ ۲۶

(۵) قرآن میں تحریف کا الزام

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کو بنیاد بنا کر مستشرقین نے مسلمانوں پر قرآن میں تحریف کا الزام عائد کیا ہے، جس طرح کہ وہ خود اپنی مقدس کتابوں کے

ساتھ کیا کرتے ہیں۔ اِس الزام کی تردید میں مولانا فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کہ وہ قرآن کی آخری دو سورتوں ''معوذتین'' کو قرآن کا حصہ نہیں مانتے تھے، گو کہ صحیح سندوں سے ثابت ہے، لیکن اول تو ان کی روایت بالکل منفرد ہے اور کسی صحابی سے اس کی تصدیق نہیں ملتی۔ دوم یہ کہ حضرت عثمان غنیؓ کے زمانۂ خلافت میں قرآن کریم کے سرکاری طور پر جو مصحف تیار کئے گئے تھے ان میں یہ دونوں سورتیں موجود ہیں۔ سوم مختلف صحیح اور معتبر احادیث سے ثابت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے نماز میں ان دونوں سورتوں کی تلاوت فرمائی تھی اور صحابہ کرامؓ کو نماز میں اور دیگر اوقات میں ان کی تلاوت کرنے کی آپؐ نے ترغیب بھی دی تھی۔ چہارم یہ کہ حضور اکرم ﷺ کے عہدِ مبارک سے آج تک دنیائے اسلام کا جس مصحف پر اجماع ہے اس میں یہ دو سورتیں درج ہیں۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ کی یہ روایت کہ حضور اکرمؐ نے ان دونوں سورتوں کے نزول کا ذکر ان سے کیا تھا، مسلم، ترمذی اور نسائی میں موجود ہے۔ یہ چند اہم دلائل اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ''معوذتین'' (قرآن کی دو آخری سورتیں) اللہ کی طرف سے اس کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ پر نازل کی گئی تھیں، نہ کہ بعد میں مسلمانوں نے ان کو اپنی طرف سے قرآن میں شامل کیا ہے۔

اب رہا سوال حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ان کی یہ رائے دراصل ایک غلط فہمی پر مبنی ہے کہ انہوں نے لفظ ''قُلْ'' (کہو) کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اور ان کی اس رائے کو مفسرین اور محدثین نے بھی غلط تصور کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا گو کہ بڑے صحابہ میں شمار ہوتا ہے، لیکن ان کی غلطی اپنی جگہ ہے اور مرتبہ اپنی جگہ پر۔ ان کی اس روایت کو بنیاد بنا کر کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ قرآن کے ماننے والوں نے اس میں ردّ و بدل کیا ہے، جس طرح کہ دوسری قوموں نے اپنی کتابوں کے ساتھ کیا ہے۔[۲۷]

قرآن کریم پر مستشرقین کے مختلف اعتراضات پر بحث کرنے کے بعد ہم یہاں ان مستشرقین کے قرآن کے مطالعہ کے بارے میں مولانا کے ایک اہم تجزیے کا

ذکر کرتے ہیں۔ تفہیم القرآن جلد سوم میں مولانا فرماتے ہیں کہ ان معترضین کا مطالعہ اور تحقیق آزاد نہیں، بلکہ مفروضوں کی پابند ہے۔ ان لوگوں نے پہلے یہ فرض کرلیا ہے کہ قرآن کریم بہر حال وحی الٰہی نہیں، بلکہ انسان کی تخلیق ہے (معاذ اللہ) اس مفروضہ کے تحت یہ اس مقدس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں اور کسی طرح اس میں اپنا مطلب نکال لیتے ہیں ۲۸؎ مطالعہ کا یہ طریقۂ کار غلط ہے۔ کسی بھی کتاب کا آزادانہ ذہن کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے، تاکہ اس کے صحیح جذبہ کو سمجھایا جا سکے اور اس کے حقائق تک رسائی حاصل کی جا سکے۔ قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے بھی یہی اصول اپنایا جانا چاہیے۔ تفہیم القرآن کے دیباچہ میں مولانا رقم طراز ہیں:

''کوئی شخص چاہے قرآن پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، بہر حال اگر وہ اس کتاب کو فی الواقع سمجھنا چاہتا ہے تو اولین کام اسے یہ کرنا چاہیے کہ اپنے ذہن کو پہلے سے قائم کیے ہوئے تصورات اور نظریات سے اور موافقانہ یا مخالفانہ اغراض سے، جس حد تک ممکن ہو، خالی کرلے اور سمجھنے کا خالص مقصد لے کر کھلے دل سے اس کو پڑھنا شروع کرے۔ جو لوگ چند مخصوص قسم کے خیالات ذہن میں لے کر اس کتاب کو پڑھتے ہیں وہ اس کی سطروں کے درمیان اپنے ہی خیالات پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن کی ان کو ہوا بھی لگنے نہیں پاتی۔ ۲۹؎

مولانا کا خیال بالکل درست ہے۔ ورنہ ان مستشرقین کے گروہ میں جن لوگوں نے آزادیٔ ذہن سے قرآن کو پڑھا ہے ان پر اس کتاب کی حقیقت منکشف ہوئی، وہ اس کے قایل ہوئے اور اس پر ایمان بھی لائے۔

سیرت طیبہ پر مستشرقین کے اعتراضات

مستشرقین کے ایک مستقل گروہ نے سیرت طیبہ پر تحقیق کی ہے اور کئی کتابیں، مقالات اور مضامین لکھے ہیں۔ ڈاکٹر نثار احمد کی مرتبہ ایک فہرست کے مطابق ان کی سیرت پر کتابوں کی جملہ تعداد اب تک ۱۷۱ اور مضامین اور مقالات کی تعداد

۲۸۶ تک پہونچ گئی ہے۔ جس طرح ان لوگوں نے قرآن کریم پر مختلف قسم کے اعتراضات کیے ہیں اسی طرح پیغمبر خدا حضرت محمد ﷺ کی سیرت میں بھی خامیاں تلاش کرنے اور کسی طرح آپ کو رسوا کرنے کی کوشش کی ہے۔ سیرت پر ان کے الزامات کی تعداد ڈاکٹر نثار احمد نے ۵۹ بتائی ہے، جو آپؐ کے حسب نسب سے شروع ہوکر آپ کو ایک جھوٹا نبی (نعوذ باللہ) ثابت کرنے کی کوشش تک پھیلے ہوئے ہیں۔[۳۰] تفہیم القرآن میں ان میں سے چند اعتراضات پر مولانا مودودی نے بھی بحث کی ہے۔

(۱) مرگی اور جنون

اس تہمت کی تردید میں مولانا مودودی کے دلائل اور سرسید کے دلائل میں ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایک ایسا شخص جو مرگی جیسے مرض میں مبتلا ہو اور اس مرض کے دوروں کی حالت میں اس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہو وہ اسے ایک تحریک بنا کر پیش کرے اور یہ تحریک اس درجہ کامیاب ہو کہ بنی نوع انسان کے لیے رحمت بن جائے۔ اور نہ صرف جزیرۂ عرب، بلکہ دنیا بھر میں اس کی شہرت ہو۔ کیا کبھی دنیا میں ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ذہنی مریض اللہ کا نبیؐ، ایک عظیم قائد و مصلحِ قوم بنا ہو جس نے اپنے قول و عمل کے ذریعہ قوم کی اصلاح کی ہو؟۔[۳۱]

آگے مولانا اظہار خیال فرماتے ہیں کہ اس تہمت کی تردید خود قرآن اور حیات طیبہ سے بھی ہو جاتی ہے، اگر کوئی ان دونوں بنیادی ماخذ پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔ قرآن ایک عمدہ کلام ہے جو ایک مریض کی زبان سے جاری نہیں ہوسکتا۔ ایسے مریض تو الٹی سیدھی جو جی میں آئے بکتے رہتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں نہ کوئی معقولیت ہوتی ہے اور نہ کوئی سنجیدگی اور نہ ہی کوئی مطلب معنی ہوتے ہیں۔ سورۃ المدثر میں اللہ نے اپنے پیغمبر کو جو اولین ہدایت دی تھی وہ اس الزام کی تردید کے لیے ایک ٹھوس ثبوت ہے۔ دراصل یہ وہی ہدایت ہے جو اللہ نے حضرت نوحؑ کو اپنا رسول مقرر کرتے وقت دی تھی:

''اپنی قوم کے لوگوں کو ڈراؤ قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آجائے۔''[۴۲]

آپؐ کے بہترین اخلاق، جن سے احادیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی اعصابی مریض ایسے عمدہ اخلاق پیش کر سکے۔ عقل بھی اس کو تسلیم نہیں کرتی کہ ایسا شخص کردار کا نمونہ بھی پیش کر سکتا ہے کہ جس سے متاثر ہو کر اس کا جانی دشمن بھی اس کا قائل ہو جاتا ہے اور اس کو اللہ کا نبی تسلیم کرتا ہے۔[۴۳]

آں حضرتؐ پر ان کی اس تہمت کو مولانا مذہبی تعصب سے تعبیر کرتے ہیں اور مزید اشارہ فرماتے ہیں کہ چودہ سو برس پہلے مکہ کی جاہل قوم اپنے دل کی تسلی کے لیے بے بنیاد اور غیر معقول الزامات آپؐ پر گھڑا کرتی تھی۔ ان مغربی مصنفین میں بھی اس قسم کی بو آتی ہے[۴۴]

(۲) کثرتِ ازدواج

حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول تھے اور منصب نبوت پر مامور کیے گئے تھے۔ چنانچہ اس حیثیت سے آپؐ پر اللہ کی طرف سے خاص احکام عائد کیے گئے تھے، جو عام آدمی کے لیے نہیں تھے جس کا عمل صرف آپؐ تک ہی محدود ہے۔ لیکن مستشرقین نے اسے بھی اعتراض کا نشانہ بنایا ہے۔ اور آپؐ پر الزام عائد کیا ہے کہ آپؐ نے محض اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کے لیے مختلف نکاح فرمائے تھے۔ (نعوذ باللہ)

اِس ضمن میں مولانا وضاحت فرماتے ہیں کہ آں حضرتؐ نے جتنی شادیاں کی تھیں اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو خود بخود اس الزام کی تردید ہو جاتی ہے۔ مثلاً پہلا نکاح آپؐ نے ۲۵ سال کی عمر میں بی بی خدیجہؓ سے فرمایا تھا، جو ایک بیوہ خاتون تھیں اور جن کی عمر ۴۰ سال تھی۔ آپؐ ان کے ساتھ نہایت خوش گوار ازدواجی زندگی بسر کرتے رہے۔ اور جب ۲۵ سال بعد ان کا انتقال ہو گیا تو آپؐ نے ایک معمر خاتون سودہؓ سے نکاح فرمایا اور پورے چار سال وہ آپ کی رفیق حیات رہیں۔ اس طرح ان

دونوں نکاح تک آپ ۵۴ برس کی عمر کو پہونچ گئے۔ اب کس بنیاد پر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس عمر میں آپ کی خواہش نفسانی بڑھ گئی تھی جس کی تکمیل کے لیے آپ کو اور نکاح کرنے پڑے۔

بات دراصل یہ ہے کہ آپ اللہ کے نبی مقرر کیے گئے تھے۔ اسلام کی تبلیغ اور جاہل و غیر متمدن قوم کی اصلاح کا کام آپ کے سپرد کیا گیا تھا۔ ہر شعبۂ حیات میں اپنے قول و فعل کے ذریعہ سے اس جاہل قوم کے فرسودہ عقائد، توہمات اور غیر مذہبی رسومات کو مٹا کر ان میں اسلام کی نئی روح پھونکنی تھی۔ اس فرض کو انجام دینے کے لیے ضروری تھا کہ آپ معاشرہ میں برابر عورتوں اور مردوں سے اپنے روابط قائم کرتے اور ان کی تربیت کا بیڑا اٹھاتے۔ چنانچہ آپ نے مختلف عمروں اور ذہنی صلاحیتوں کی متعدد خواتین سے نکاح فرمایا اور ان کی راست اصلاح فرمائی۔ ساتھ ساتھ ایک اور مصلحت یہ بھی رہی ہے کہ مختلف خاندانوں سے آپ نے تعلقات قائم کیے اور اپنی تحریک کو دن بدن پھیلاتے رہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ سے نکاح کے ذریعہ دو اہم شخصیتوں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے اپنے تعلقات کو آپ نے مضبوط تر بنایا۔ اُمِ سلمہؓ اور اُمِ حبیبہؓ سے نکاح فرما کر آپ نے ان خاندانوں سے عداوت کو کم کیا۔ حضرت صفیہؓ، حضرت جویریہؓ، اور حضرت ریحانہ کو آزاد کر کے آپ نے انہیں اپنی زوجیت کا درجہ عطا فرمایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے خلاف یہودیوں کا زور کم ہوتا چلا گیا۔ اس لئے کہ اُس زمانے میں قبیلہ کے داماد سے لڑنا جھگڑنا معیوب بات سمجھی جاتی تھی۔ یہ تھے وہ تبلیغی، تعلیمی، اصلاحی، سیاسی اور اجتماعی اغراض اور مصلحتیں جس کے لیے آپ کو اتنے نکاح کرنے پڑے تھے، جس کو ان مستشرقین نے نفسانی خواہش کا نام دیا ہے۔[۳۵]

(۳) حضرت زینبؓ سے آپ کا نکاح

حضرت زینبؓ سے آپ کے نکاح کو مختلف مستشرقین نے افسانہ بنانے کی

کوشش کی ہے اور آپ ؐ پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ آپ ؐ (معاذ اللہ) اپنی بہو پر عاشق ہو گئے تھے، چنانچہ زیدؓ سے علیحدہ کرا کے آپ ؐ نے خود ان سے نکاح فرمایا تھا۔ اِس اعتراض کے جواب میں مولانا نے چند حقیقتوں کو واضح کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت زینبؓ، جیسا کہ سب جانتے ہیں، حضور کی پھوپی زاد بہن تھیں۔ اگر آپ کو منظور ہوتا تو خود نکاح فرما سکتے تھے۔ لیکن آپ ؐ نے خود ایک بڑی مصلحت کے پیش نظر زینبؓ کا نکاح زیدؓ سے کروایا تھا۔ حضرت زینبؓ مکہ کے ایک معزز گھرانے کی لڑکی تھیں اور زیدؓ حضور ؐ کے آزاد شدہ غلام اور متبنٰی لڑکے تھے۔ لہٰذا آپ ؐ چاہتے تھے کہ سماج سے اعلیٰ اور ادنیٰ کے فرق کو مٹایا جائے اور مساوات کو بڑھاوا دیا جائے۔ اس مصلحت کے تحت آپ ؐ نے دونوں کا نکاح کرایا تھا۔ لیکن ان دونوں زن و شو میں نباہ نہ ہو سکا اور علیٰحدگی کی نوبت آ گئی۔ اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو اشارہ مل گیا تھا کہ زیدؓ جب اپنی بیوی کو طلاق دیں تو اس مطلقہ خاتون سے آپ کو نکاح کرنا ہوگا۔ ادھر اللہ کے حکم کی تعمیل کرنی تھی اور اُدھر یہ خیال تھا کہ دشمنانِ مکہ آپ ؐ پر اعتراض کریں گے اور بدنام کرنے کی کوشش کریں گے کہ محمد ؐ نے اپنی بہو سے نکاح کر لیا ہے۔ آپ ؐ نے حضرت زیدؓ کو ہدایت کی اور علیٰحدگی کے خیال کو ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن آپس میں تلخی بڑھتی گئی، بالآخر علیحدگی ہو گئی اور آپ ؐ کو اللہ کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ یہ حکم اللہ کی طرف سے خاص طور پر دیا گیا تھا، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ ؐ کو قول و عمل دونوں طریقوں سے معاشرہ کی اصلاح کرنی تھی۔ متبنیٰ کی مطلقہ سے نکاح کو اس معاشرہ میں حرام سمجھا جاتا تھا، لہٰذا آپ ؐ نے اس فرسودہ رسم کو اپنے عمل کے ذریعہ سے مٹا کر دکھایا، جیسا کہ خدا اپنے آخری نبی سے اپنی رضا کا ظہور چاہتا تھا[۳۶]

جزیرۂ عرب کے یہودیوں کے بارے میں مستشرقین کی غلط فہمی:

مولانا مودودی کا خیال ہے کہ جزیرۂ عرب میں یہودیوں کی آمد کے بارے میں کوئی یقینی معلومات تاریخ میں نہیں ملتی ہیں۔ ان کی حجاز میں آبادی کا علم اہل عرب

کی چند زبانی روایات پر منحصر ہے۔ اور یہ روایتیں بکثرت خود یہودیوں ہی کی طرف منسوب ہیں، جس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے ۔ درحقیقت ان حجازی یہودیوں کی نسبت جو ثابت ہے وہ یہ ہے کہ یہودی اس علاقہ میں اس وقت آئے تھے جب کہ ۷۰ء میں رومیوں نے فلسطین میں ان کا قتل عام شروع کیا اور ۱۳۲ء میں انہیں فلسطین سے مار بھگایا تھا۔ چوں کہ حجاز کا علاقہ فلسطین کے جنوب میں متصل ہی واقع ہے۔ پناہ حاصل کرنے کے لیے انہیں قریب اور آسان جگہ یہی ملی۔ یہاں آکر ان لوگوں نے اُبلہ، مقنا، تبوک، تیما، وادی القریٰ، فدک اور خیبر و یثرب وغیرہ کو اپنا ٹھکانا بنایا تھا۔

جزیرۂ عرب میں ان یہودیوں کو عربوں سے ہی سابقہ پڑا اور یہ چالاک قوم اپنی چال بازیوں، سودخوری کے دھندوں سے اپنا مقام بناتی چلی گئی۔ یہاں ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ مقامی کلچر کو اپنا لیں، تاکہ جلد از جلد یہاں کے ماحول میں گھل مل جائیں۔ نتیجتاً ان کی مادری زبان عربی ہوگئی اور وہ عبرانی سے دور ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ انھوں نے عربوں سے شادی بیاہ کے تعلقات بھی قائم کر لئے تھے۔ دونوں قوموں کے درمیان فرق صرف مذہبی عقائد کا باقی رہ گیا تھا، ورنہ بہ ظاہر ان میں کوئی امتیاز باقی نہ تھا۔ چناں چہ اس ظاہری عربیت کو دیکھ کر مستشرقین کو دھوکہ ہوگیا ہے اور یہ گمان کرنے لگے ہیں کہ یہ مقامی عرب ہی تھے جنھوں نے یہودیت قبول کر لی تھی، یا ان میں بکثرت عرب یہودی شامل ہیں۔ [۳۷] تاریخ کی رو سے یہ دعویٰ غیر مستند قرار پاتا ہے۔ اور کہیں اس بات کا پتہ نہیں ملتا کہ یہودیوں نے کبھی حجاز میں اپنے مذہب کی تبلیغ کی تھی اور یہاں کے مقامی عربوں کو یہودی بنالیا تھا۔ [۳۸]

تبصرہ:

اگرچہ مولانا مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں مختلف مقامات پر مستشرقین، مغربی مصنفین، مغربی مستشرقین یا عیسائی مشنریاں جیسی اصطلاحیں استعمال کی ہیں، لیکن کسی بھی خاص مستشرق یا اِس کی کسی کتاب یا مضمون کا حوالہ ہمیں اس میں نہیں ملتا۔ البتہ کہیں کہیں مولانا نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور جیوش انسائیکلوپیڈیا کے حوالے

ضرور دیے ہیں۔ اس کی وجہ بہ ظاہر یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر مولانا کے پیش نظر تھی، نہ کہ تمام مستشرقین کے اعتراضات کو یکجا کر کے ان پر مفصل بحث۔ لہٰذا اپنی اس تصنیف میں مولانا نے جہاں جہاں ضروری سمجھا ان مستشرقین کے بنیادی اعتراضات کا مختصر، مذہبی، منطقی، فلسفیانہ، سائنس، تاریخ اور آثار قدیمہ کی نئی تحقیقات پر مبنی رد لکھا ہے۔ مولانا کا مخاطب جدید تعلیم یافتہ طبقہ تھا، جس کو اپنے ماخذ سے زیادہ مغربی تعبیرات پر اعتبار تھا اور جس کے مطالعہ میں اکثر بار بار دہرائے جانے والے وہ اعتراضات تھے جن کا مقصد ہی تشکیک کو جنم دینا تھا۔ ایک بار قرآن سے یقین اٹھے یا رسولِ اُمّی سے ربط ٹوٹے تو ایمان یا اسلام کا نام ہی نام رہ جاتا ہے۔ مولانا اس طبقہ کو مطمئن کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

حواشی

۱۔ ''اسلام اور مستشرقین'' خطبۂ استقبالیہ، مولانا ابوالحسن علی ندوی، معارف، مارچ ۸۳ء ص ۲۳۲۔۲۳۳

۲۔ روزنامہ جسارت، سید مودودی نمبر، کراچی، ص ۱۰۴

۳۔ تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۷۰۔

۴۔ بائبل، کتاب پیدائش، باب ۲، آیات ۷۔۲۵، باب ۳ آیات ۱۔۲۴

۵۔ تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۱۳۵-۱۳۶

۶۔ تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۱۷۱-۱۷۲

۷۔ تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۲۲۹-۲۳۰

۸۔ تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۲۳۳

۹۔ تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۳۶-۳۷

۱۰۔ تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۴۶۲-۴۶۳

۱۱۔ تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۱۱۴

۱۲۔ تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۴۳۳-۴۳۴

۱۳۔ تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۳۹۶-۳۹۷

۱۴۔ تفہیم القرآن، ج۳،ص ۶۶۵-۶۶۶
۱۵۔ تفہیم القرآن، ج۴،ص۴۰۴-۴۰۵
۱۶۔ تفہیم القرآن، ج۱،ص ۴۲۴-۴۲۵
۱۷۔ تفہیم القرآن، ج۱،ص۴۲۴-۴۲۵
۱۸۔ تفہیم القرآن، ج۳،ص۵۸۲
۱۹۔ تفہیم القرآن، ج۳،ص۱۷۱-۱۷۲
۲۰۔ تفہیم القرآن، ج۲،ص۳۹۶
۲۱۔ تفہیم القرآن، ج۳،ص۳۶-۳۷
۲۲۔ تفہیم القرآن، ج۵،ص۲۳۰-۲۳۱
۲۳۔ قرآن مجید، مترجم و محشیٰ، ص۶۸۵
۲۴۔ تفہیم القرآن، ج۴،ص۳۰۸
۲۵۔ تفہیم القرآن، ج۳،ص۱۱۳-۱۱۴
۲۶۔ Dictionary of Islam . P. 564
۲۷۔ تفہیم القرآن، ج۶،ص۵۴۹-۵۵۲
۲۸۔ تفہیم القرآن، ج۳،ص۳۶-۳۷
۲۹۔ تفہیم القرآن، ج۱،ص۳۱-۳۲
۳۰۔ ''مطالعۂ سیرۃ اور مستشرقین'' ڈاکٹر نثار احمد، ''معارف'' اگست ۸۴ء ص۹۷-۱۰۵
۳۱۔ تفہیم القرآن، ج۳،ص۲۹۱
۳۲۔ تفہیم القرآن، ج۶،ص۱۴۶-۱۴۲، مزید دیکھئے ''سرسید احمد خان اور مستشرقین'' عبید اللہ کوثی ندوی، ''معارف'' دسمبر ۸۵ء ص۸۸۰-۸۸۱
۳۳۔ تفہیم القرآن، ج ۶،ص۶۰
۳۴۔ تفہیم القرآن، ج۵،ص۱۷۳
۳۵۔ تفہیم القرآن، ج۴،ص۱۱۴-۱۱۶
۳۶۔ تفہیم القرآن، ج۴،ص۹۸-۱۰۳
۳۷۔ تفہیم القرآن، ج۵،ص۳۷۰-۳۷۲
۳۸۔ تفہیم القرآن، ج۵،ص۳۷۳